ISSN-2582-1229,E-ISSN-2582-9157(۲) شمارہ ٦ جلد ۲۰۲۴ء اپریل-جون

UGC Care Listed International Peer Reviewed

Refereed Journal

یو جی سی کیئر لسٹیڈ بین الاقوامی پیر ریویوڈ ریفریڈ جرنل

سہ ماہی دہلی

تاریخ ادب اردو

اپریل تا جون ۲۰۲۴ء

April to June 2024

جلد:٦

شمارہ:(۲)

اردو ادب کا علمی، ادبی اور تحقیقی ترجمان

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

www.tareekheadabeurdu.com

سہ ماہی دہلی

تاریخ ادب اردو

اردو ادب کا نقیب و ترجمان

جلد:۶ {اپریل تا جون ۲۰۲۴} شمارہ:۲

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد بہلول

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد طالب

خط و کتابت/ترسیل وزر کا پتہ

سہ ماہی تاریخ ادب اردو دہلی، ۲۴۹۶، دوسری منزل، پنجابی بستی، سبزی منڈی، گھنٹہ گھر، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

2496, 2nd Floor, Punjabi Basti, Sabzi Mandi, Ghanta Ghar,Delhi-07

E-mail: editortau@gmail.com

Website: tareekheadabeurdu.com

Mobile No.: +919968244001

اس شمارہ کے مشمولات سے مدیر/ وابستگان کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی تحریر/ اقتباس کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔ ''تاریخ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

مشمولات

اداریہ مدیر 5

ا۔تخلیقی وابستگی کا شاعر:سلیم محی الدین ڈاکٹر احمد امتیاز 8

۲۔ڈاکٹر وحید اختر عشرت کی شخصیت پر اقبالیاتی نقوش ڈاکٹر رفعت چودھری 15

۳۔بلراج بخشی کے شعری رویّے ڈاکٹر الطاف انجم 33

۴۔جنگ آزادی کی ایک مثالی تحریک ڈاکٹر جاوید ندیم ندوی 45

۵۔تمل ناڈو میں اردو نثر۔آزادی کے بعد۔ایک جائزہ ڈاکٹر کے۔ایچ۔کلیم اللہ 58

۶۔امیر مینائی کی نعتیہ شاعری ڈاکٹر نشاں زیدی 64

۷۔امن کی تعلیم-مختلف مذاہب۔ڈاکٹر ندیم احمد، پروین کمار سورجن، شیخ احتشام الدین 73

۸۔بنگال میں اردو زبان کا آغاز وارتقاء اور فورٹ ولیم کالج ڈاکٹر نور النساء 85

۹۔ادا جعفری کی شاعری میں انسانی افکار واقدار ڈاکٹر محمد طالب 94

۱۰۔خواجہ میر دردؔ اور ان کا فارسی کلام ڈاکٹر ظفر امام 104

۱۱۔وطن عزیز کا شیدائی:اقبال عمران اعظم 122

۱۲۔جدید غزل میں اقدار کا کرائسس عرفان علی بشر 130

۱۳۔شمس الرحمٰن فاروقی کا افسانہ ''سوار'' دہلوی تہذیب کا بیانیہ محمد افضل حسین 142

۱۴۔حنیف نقوی کی محققانہ بصیرت:ایک جائزہ عبدالقیوم 158

۱۵۔سرسید احمد خاں اور تعلیم نسواں ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ 168

۱۶۔ The Indian Culture: A Study of Urdu Language and Literature Prof. (Dr.) Md. Yahya Saba 179

۱۷۔ Nation or Civilization? Problem of History in Intizar Husain's Basti Mohammad Irfan 207

شمس الرحمٰن فاروقی کا افسانہ ''سوار'' دہلوی تہذیب کا بیانیہ

کلیدی الفاظ: تہذیب# رسم ورواج# ہنگامہ خیزی# فنون#رنگارنگی# مستحکم #شگفتہ# تلمیحات# بودوباش

محمد افضل حسین

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی ہلدوانی، اتراکھنڈ

تلخیص: لفظ تہذیب کا استعمال کسی قوم رسم ورواج، رہنے سہنے کے طرائق، لوگوں کی زندگی کے خدوخال اور اصول وضوابط لئے کیا جاتا ہے۔تہذیب کو انگریزی لفظ کلچر کے ہم معنی تسلیم کیا گیا ہے۔ بقول سید ضمیر حسن دہلوی ''تہذیب کا تعلق لطیف معروضی عقائد اور سنجیدہ ذہنی اقدار سے ہے ۔تہذیب ظاہر میں نہیں باطن میں تبدیلیاں لاتی ہے۔اسی لیے تہذیب کا درس نامعتبر نہیں۔تہذیب ریاکار نہیں، زمانہ ساز نہیں۔'' دیگر تہذیبوں کی طرح دہلی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہے ۔دہلوی تہذیب کا بیان فارسی آمیز الفاظ اور مختلف مناظر کی رنگارنگ تفاصیل کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔فاروقی کا افسانہ 'سوار' اسی کا آئینہ دار ہے۔

اولاً تہذیب کے حوالے سے سید ضمیر حسن دہلوی کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''تہذیب کمہار کے آوے کی طرح انسانیت پر جو رنگ چڑھاتی ہے پختہ چڑھاتی ہے، تہذیب کا تعلق لطیف معروضی عقائد اور سنجیدہ ذہنی اقدار سے ہے ۔تہذیب ظاہر میں نہیں باطن میں تبدیلیاں لاتی ہے۔ اسی لیے تہذیب کا درس نامعتبر نہیں۔ تہذیب ریاکار نہیں ،زمانہ ساز نہیں۔ دلی کی تہذیب کا یہ اثر تھا کہ اس نے ہمیشہ نیک نیتی، بھلمنساہی، شرافت نفس اور انسانیت کو فروغ دیا۔ دلی ایک

دن میں نہیں، ایک سال میں نہیں، ایک صدی میں نہیں قرنوں میں
بنی تھی اس لیے اس کا جادوئی اثر بھی دیر پا اور دائمی تھا۔''
(سید ضمیر حسن دہلوی: غالب کی دلی، ص ۱۱، تاج پبلشر دہلی۔ ۱۹۷۷ء)

شمس الرحمٰن فاروقی کی تخلیق کردہ کہانی 'سوار' ۵۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کی اشاعت 'شب خون' شمارہ نمبر ۲۲۲ بابت ماہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں ہوئی۔ فاروقی نے اسے 'عمر شیخ مرزا' کے فرضی نام سے شائع کیا جو در حقیقت مغل شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے والد کا نام ہے۔ 'غالب افسانہ' کی اشاعت کے بعد بنی مادھو رسوا کو جاننے کے لیے لوگوں میں کافی بے چینی رہی، کچھ لوگوں نے تو پہچان ہی لیا تھا لہٰذا فاروقی نے نام بدل لیا، حالاں کہ عمر شیخ مرزا بھی زیادہ دیر تک چھپے نہ رہے۔ گیان چند جین، نیّر مسعود، عابد سہیل اور دوسرے کچھ احباب نے پہچان لیا کہ یہ کام شمس الرحمٰن فاروقی کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ واضح ہو کہ فاروقی نے اس کے علاوہ ۹/افسانے اور تخلیق کیے، جو جاوید جمیل اور شہزاد کے فرضی نام سے شائع کیے گئے جس میں جدید تخلیقی رویّوں کی پیشکش نظر آتی ہے۔ لیکن متذکرہ بالا افسانوں کو وہ شہرت اور پذیرائی نہ مل سکی جو 'غالب افسانہ، سوار، آفتاب زمیں، ان صحبتوں میں آخر' کو حاصل ہوئی۔ چوں کہ یہ افسانے ہمارے کلاسیکی ادب اور ہند اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتے تھے، ساتھ ہی اردو ادب کے یکتائے روزگار، استاد شعرا کے حالات وکوائف پر روشنی ڈالتے ہیں، اسی سبب ان افسانوں میں مزید جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ اردو ادب اور ہند اسلامی تہذیب سے دل چسپی رکھنے والا ہر شخص ان افسانوں کی کہانی، زبان کی چاشنی، اُسلوب کی دل کشی، تہذیب کی پیش کش اور مکالموں کے حُسن سے لطف اندوزی کرتا نظر آتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا دل چسپ اور شفاف بیانیہ اس کہانی میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے، اس کہانی کا مرکزی کردار شہر دہلی ہے، فاروقی نے دلی کی تہذیب کو مرکزی نقطہ دے کر کہانی خلق کی ہے۔ دلی دنیا کے ان بڑے شہروں میں سے ایک ہے جو اپنی

تہذیب، کلچر اور فنکاری کے لیے مشہور ہیں، بہ قول سید ضمیر حسن دہلوی ''روم ایک دن میں نہیں بنا تھا، یہ قول دلی پر بھی صادق آتا ہے۔ پانڈووں کے زمانے سے لیکر مغلوں کے زمانے تک دلی نے خدا جھوٹ نہ بلوائے ، سینکڑوں انقلابات دیکھے ہوں گے'' اتنے نشیب وفراز دیکھنے کے بعد بھی دلی نے اہل ہنر کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، خسرو اسے 'جنت عدن' کہتے تھے، ہندو مؤرخین اسے بے شمار جواہرات کا خزانہ مانتے رہے، دلی میں اسلامی سلطنت کے استحکام کے بعد یہاں سمرقند، بخارا، ایران اور افغانستان سے بے شمار علما، فضلا، فنکار، اہل حرفہ، صنعتکار و دانشور اور حکما آکر بسے۔ ترک امیر دور دراز کے صوبوں سے دولت لے کر آتے اور یہاں آکر داد عیش دیتے، غوری کی موت کے بعد قطب الدین نے اسے ایسا شہر بنایا کہ روم، دمشق اور بصرہ اس پر رشک کرنے لگے۔ دولت کی فراوانی کے سبب ہر جگہ سے لوگ آکر بستے گئے اور مختلف مذاہب و مشترکہ تہذیب وتمدّن کی بنیاد پڑی جو عہدِ مغلیہ میں اَوج کمال کو جا پہنچی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں محمد شاہ کے قتل کے بعد دلی سیاسی لحاظ سے بے وقعت ہو گئی تھی لیکن ادبی ہنگامہ خیزی اور فنون کی رنگارنگی جوں کی توں قائم تھی، اس کی تہذیبی حیثیت بالکل مستحکم نظر آتی تھی۔ فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اٹھارہویں صدی کو میں ہند اسلامی تہذیبی تاریخ کا زریں باب سمجھتا ہوں۔ اردو فارسی ادب ، تصوّف، علوم عقلیہ ونقلیہ، فنون حرب وضرب، موسیقی، ان میدانوں میں اٹھارہویں صدی والوں نے جو نئے نئے مضمار رو بیدا دریافت اور فتح کیے ان کی مثال پہلے نہیں ملتی، بعد میں ملنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں، اور اٹھارہویں صدی کی دہلی کا کوئی کیا حال لکھے، ہم لوگ چند شہر آشوبوں، چند ہجوؤں، تعصب اور کینہ پر مبنی چند افسانوں کو تاریخ قرار دے کر اٹھارہویں صدی کی دہلی کو زوال، انتشار، بد امنی، طوائف الملوکی، امیروں کی مفلسی اور غریبوں کی فاقہ کشی کا شہر سمجھتے ہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص۲۰)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی علوم وفنون کی آماجگاہ تھی لہٰذا کسی ادیب اور فنکار کے لیے دلی سے وابستگی یا اس کی تہذیبی شناخت سے عقیدت رکھنا فطری بات ہے، فاروقی کے افسانوں پر غور کریں تو واضح ہوجاتا ہے کہ دلی کی تہذیب سے محبت ہی ان کے افسانوں کی تخلیق کا اصل محرک ہے، فاروقی لکھتے ہیں:

''میں اس دلی کا دلدادہ تھا کیوں کہ اردو کی ادبی تہذیب صحیح معنی میں اپنا رنگ اور طور طریق محمد شاہ اور احمد شاہ پھر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں حاصل کرتی ہے۔ سیاسی قوّت اس شہر کی بھلے گھٹ گئی ہو لیکن اس کی تہذیب زوال آمادہ اور انحطاط آلودنہ تھی، اور دس بار لٹنے کے بعد بھی اس شہر کی گلیوں میں بھیرونہیں، بلکہ اس زمانے کی حسین ترین رقاصائیں ناچتی پھرتی تھیں، دلی کا چھوٹا سا پیکر آصف الدّولہ کے وقت سے لے کر واجد علی شاہ کے عہد کا لکھنؤ تھا، لیکن افسوس کہ لکھنؤ کی تہذیب ہمارے ذہنوں میں پریم چند کے افسانوں اور ستیہ جیت رائے کی فلم نے بنائی ہے، ٹھوس تاریخ نے نہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص۲۷)

اس میں شک نہیں کہ اٹھارہویں صدی کے آتے آتے جب کمپنی بہادر کا غلبہ پورے ملک پر ہوگیا تو مقامی بادشاہوں اور حکمرانوں کو سرکار انگلشیہ کے حضور سرنگوں ہونا پڑا۔ روہیلوں نے اکبر شاہ ثانی کی ناک میں دَم کر رکھا تھا ان سے نپٹنے کے لیے شاہ نے مرہٹوں سے مدد مانگی لیکن سوئے قسمت کہ مرہٹے اور جاٹ پہلے سے ہی تاک میں بیٹھے تھے دونوں ایک ہوگئے، دونوں نے مل کر دلی پر یورش کردی، مجبور ولاچار شہنشاہ نے انگریزوں سے محافظت کا معاہدہ کرلیا۔ سرکار انگلشیہ سے شہنشاہ کو ایک لاکھ معاوضہ ملتا تھا، اس شرط پر کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد مغلیہ سلطنت کا کوئی بادشاہ نہیں ہوگا۔ ایسے مصائب و آلام بھی آئے کہ شہزادہ اور شہزادیوں نے فاقے

برداشت کیے، ایسے وقت میں دلی کی سیاسی قوت بالکل ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی تہذیب کی شہرت ایران وتوران، سمرقند و بخارا اور یورپ تک تھی، فاروقی نے دلی کی عظمت اور اس کی فراموش کردہ تہذیب کو اُجاگر کرنے کا عزم کیا، رفتہ رفتہ فاروقی نے مرقع دہلی، آبِ حیات، متفرق اشعار اور میر جعفر زٹلی کے دیوان سے وہ نمونے اخذ کیے جن کا تعلق دہلی اور اس کی تہذیب وثقافت کے بیان میں معاون تھا، کہانی کے لیے خام مواد یکجا کرنے کے بعد دلی کا نقشہ کھینچنے بیٹھے، فاروقی لکھتے ہیں:

> ''دلی کا حق تھوڑا بہت ادا کرنے کے لیے میں نے پہلے میر کے بارے میں افسانہ نہیں لکھا، بلکہ سوار لکھا، میرے اپنے حساب سے اس افسانے کا مرکزی کردار خود شہر دہلی ہے کہ جس کے بغیر وہ پراسرار سوار ہوتا نہ بدھ سنگھ قلندر، نہ عصمت جہاں اور نہ افسانے کا راوی مولوی خیر الدین۔ ان سب کی شخصیتیں دلی کی شخصیت کا ذرا ذرا سا ٹکڑا ہیں۔ پھر سوار کے بعد مجھے 'ان صحبتوں میں آخر' لکھنا ہی تھا اور وہاں بھی جیسا کہ بہت سے پڑھنے والوں نے محسوس کیا، صرف میر نہیں ہیں۔ اس کے بعد 'آفتاب زمین' آتا ہے جس میں دلی کی جھلک بھی ہے اور دلی کی اولاد معنوی یا اس کے جانشین کے طور پر لکھنؤ دھیرے دھیرے خود کو قائم کر رہا ہے، لیکن اس کے لیے شجاع الدولہ اور سعادت علی خان کا خون گرم برق خرمن بن گیا۔''
>
> (شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص ۲۸)

کہانی:

خیر الدین اس کہانی کا راوی ہے جو شاہ عبدالرحیم کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں زیر تعلیم ہے وہ اپنی کہانی سناتا ہے۔ اس کے گھر ماں کے علاوہ ایک بہن ستی ہے جو جوان ہے، والد کا انتقال ہو چکا ہے، ستی اپنے بھائی خیر الدین سے کسی 'خنگ سوار' کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے جو روز شہر میں نکلتا ہے اور لوگ جوق در جوق

اس کا دیدار کرتے ہیں، سوار کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کوئی بزرگ ہستی ہے جسے دیکھ کر لوگ منتیں مانگتے ہیں جو پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ خیرالدین کے ہمراہ ستی ایک دن اس سوار کا دیدار کرتی ہے اور اپنے بھائی کے لیے ایک دلہن مانگتی ہے اور خیرالدین ستی کے لیے رشتے کے منت مانگتا ہے، سوار کے جانے کے بعد ستی بیگم کے لیے بقاء اللہ نامی شخص کا رشتہ آ جاتا ہے جو بہت مناسب ہے، ادھر خیرالدین کی ملاقات ایک بازار میں کتاب فروش کی دکان پر بدھ سنگھ قلندر سے ہو جاتی ہے۔ دونوں دوست بن جاتے ہیں، قلندر کے مشورے پر دونوں خانقاہ مظہری جاتے ہیں جہاں انھیں مرزا مظہر جانِ جاناں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے اسی وقت مرزا مظہر کی بیگم بد زبانی کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں، خیرالدین ایک دن بسنت کی سیر کو نکلا اور شیخ کلیم الدین کی درگاہ کے سامنے قوّالوں کی ایک ٹولی شاہ مبارک آبروؔ کی غزل پڑھ رہی تھی جس کے مضمون سے خیرالدین بھی مسرور ہو رہا تھا، اتنے میں ایک بسنتی پوش پر خیرالدین کی نگاہ پڑی اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا، یہ بسنتی پوش دراصل عصمت جہاں تھی، ایک دن عصمت جہاں سے سرسری بات چیت ہوئی لیکن جلدی کے سبب عصمت واپس چلتی بنی، خیرالدین اس کے حُسن کا شیدائی ہونے کے بعد بھی دوبارہ اس کے راستے میں نہ آیا نہ کبھی اس سے راہ بنانے کی سعی کی۔ خیرالدین کی والدہ کا انتقال ہو گیا، خیرالدین نے شادی کا خیال دل سے نکال پھینکا اور عصمت تخلص اختیار کر کے شاعری کرنے لگا۔

زبان:

فاروقی نے اس کہانی میں سب سے زیادہ فوکس دلی اور دلی کی زبان پر کیا ہے چونکہ دہلوی تہذیب کے عناصر میں ایک اہم عنصر اس کی زبانی شناخت ہے لہٰذا اس کی زبانی شناخت کو کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فاروقی کا مزاج یہ ہے کہ وہ مستند چیزوں کو ہی قبول کرتے ہیں، ہر خشک و تر کو نشانِ امتیاز نہیں بناتے، جہاں شک ہوتا ہے وہاں مناسب تنقید بھی کرتے ہیں، دلی کے حوالے سے بھی فاروقی نے تمام

روایات کومن وعن قبول نہیں کیا، زبان کے ساتھ مروّجہ علوم وفنون، معاصر شخصیات، آپس کا میل جول، ہندو مسلم یکجہتی ''سوار'' میں شیر شکر نظر آتی ہے۔ فاروقی ایک انٹر ویو کے دَوران اس پر روشنی یوں ڈالتے ہیں:

''اگر چہ میں نے دہلی کی بعض مرکزی باتوں سے انکار کیا ہے، میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دلی کی زبان کو مستند مانا جائے، میں اس بات سے بھی انکار کرتا ہوں کہ ولی نے دلی کو شعر گوئی سکھائی، لیکن اس کے باوجود دلی کی تہذیبی، ثقافتی اور مرکزی حیثیت اردو ادب میں ہمیشہ رہے گی، دلی اس زمانے میں کیسے جیتی تھی، ایک طرف تو سیاسی زوال بھی ہورہا ہے اور ایک طرف تہذیبی عروج بھی ہے، اس تناظر میں میں نے افسانہ 'سوار' لکھا۔''

(سوتکلف اور اس کی سیدھی بات [مرتب: انیس صدیقی] ص ۳۹۰)

فضا:

اس کہانی میں دلی کی پوری فضا بولتی ہے، خانقاہیں ہوں یا دربار، مدرسے ہوں یا قلندروں کی کٹیاں سب کا گذر کہانی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ روحانی ہستیاں بھی جلوہ افروز ہیں، کہیں خواجہ بختیار کا کی علیہ الرحمہ کہیں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم ہیں، کہیں شیخ کلیم الدین ہمدانی ہیں۔ موسم، تیوہار، رسومات، مقامات اور عقائد کا رنگ بھی خوب دکھائی پڑتا ہے، کہیں جامع مسجد کی جھلک ہے کہیں بسنت منایا جارہا ہے کہیں قوّالیاں سنی جارہی ہیں، کہیں درگاہوں پر عرس کی محفل ہے اور کہیں شعر وشاعری کا دربار لگا ہے غرض دلی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ کہانی کے اُفق پر ظاہر ہوتی ہے، کہانی کے توسط سے دلی کا نقشہ اور خاص طور سے اٹھارہویں صدی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سوار دلی میں پرورش پانے والی اردو شاعری یا اردو کی ادبی تہذیب کا استعارہ ہے، اسے ہر کوئی اپنے نظریے سے دیکھتا ہے اور اپنے حساب سے ہی معنی متعین کرتا ہے، کسی کو وہ رضیہ سلطانہ نظر آتی ہے، کسی کو سانڈ، کسی کو مرد تو

کسی کوخوب صورت عورت وغیرہ۔فاروقی کے مطابق 'سوار' اردو شاعری یا اردو کی تہذیب ہے جو دلی کی گلی کوچوں میں، خانقاہوں میں، درباروں میں ہر جگہ سفر کرتی ہے، ہر کوئی اسے پانا چاہتا ہے، ہر آدمی اس سے قریب ہونے کا متمنی ہے۔ یہ اس تہذیب کا جادو ہے جو اس کی شیرینی اور وسیع المشربی سے پیدا ہوا ہے۔اسے ہر انسان بلاتفریق مذہب وملت برت رہا ہے، اصلاحیں لے رہا ہے، اگر اس تناظر میں دیکھیں تو یہ کہانی علامتی انداز پر بھی مشتمل نظر آتی ہے۔اس سب کے باوجود کہانی کا بیانیہ متاثر نہیں ہوا ہے، ظاہری اور باطنی معنی کی دونوں لہریں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں، ظاہراً تو وہ جو خیرالدین اور عصمت کی شکل میں چل رہی ہے، اور باطنی طور سے وہ جو الفاظ و معنی کی بحث میں آگے بڑھ رہی تھی، فاروقی کے اس افسانے کو ہم دوسرے تمام افسانوں پر فوقیت دے سکتے ہیں۔ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

> ''سوار میں شمس الرحمٰن فاروقی نے قصے کی دل کشی، بیان کی دل آویزی اور کرداری مرقعوں کی جاذبیت کا کمال دکھایا ہے، اس لحاظ سے ''سوار'' ایک ایسا افسانہ بن گیا ہے جسے اردو افسانے میں اہم اضافہ کہا جا سکتا ہے۔''

(ڈاکٹر حنیف فوق، روشنائی، جلد۴، شمارہ۱۴، ص۱۴۱، کراچی۔۲۰۰۳)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کہانی کی بنت میں الفاظ کی جادوگری پر بے حد توجہ صرف کی ہے، یہ محض لفاظی نہیں ہے بلکہ مختلف اردو، ہندی، فارسی اور دیسی الفاظ کی مدد سے منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے گئے ہیں، بعض حضرات نے اسے طول نگاری کہہ کر اس کی اہمیت پر گرد ڈالنا چاہی، لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ دہلوی تہذیب کا بیان فارسی آمیز الفاظ اور مختلف مناظر کی رنگا رنگ تفاصیل کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس تفصیل میں بہت سے زیورات، ملبوسات، اَوزار، پھول اور دیگر چیزوں کے نام ملتے ہیں جو اس وقت کی ادبی، سیاسی وسماجی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔مثلاً جب خیرالدین عصمت جہاں کو

دیکھتا ہے اس وقت کا منظر ملاحظہ کریں:

''کھلتا ہوا سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھیں، گھنی بھوؤں کے نیچے سے مجھے دیکھتی ہوئیں، لمبے سیاہ بالوں کی کھجوری چوٹی سینے پر پڑی، موباف کے بغیر ہی اتنی بھاری کہ گات کو دبائے دیتی تھی، ہلکے کبریتی کام کی زرد ململ کا گھیردار جامہ جس کے دامن پر ذرا بھاری کشمیری کام بنا ہوا تھا، جامہ کمر پر بے حد تنگ، یا شاید کمر ہی موئے میاں کی طرح باریک تھی۔ اوپر بدن پر تنگ کرتی جس کے نیچے مخملی پیٹ جھلکتا ہوا، کرتی کے نیچے پڑاقے کی انگیا کسی ہوئی، لمبی گردن میں سرمئی سچے موتیوں کا ہار، گات کے بیچوں بیچ گردن سے ذرا نیچے نیلم کی دھکدھکی جس کے چاروں طرف ہیرے جڑے ہوئے۔ کانوں میں مٹر کے دانوں کے برابر بالکل یکرنگ زمرد کے گوشوارے جن پر جے پوری مینا کا کام، ناک میں چنے کی دال کے برابر یاقوت کی کیل۔ کلائیوں میں سبز کریلیاں، ان کے ساتھ ٹھوس سونے کے شیر دہاں۔ پاؤں میں سنہری جگمگ کرتی جوتیاں، اتنی نیچی دیوار اور مختصر دوڑ کی کہ بمشکل پنجوں اور ایڑی کو ڈھانکتی تھیں، باقی پیر پر نگار کے نقوش پیچاں صاف نظر آتے تھے، ہاتھوں کی محض ایک ایک انگلی میں الماس کی انگوٹھی، ناخنوں پر کچھ گلابی رنگ کا چمکیلا روغن، کف دست پر بھی پیچ دار نگار نمایاں۔ داہنی کلائی پر سرخ چمڑے کی پٹی پر ایک شاہین بچہ۔ جامے کا دامن تھوڑا اُٹھا ہوا کہ نازک نازک ٹخنے اور سڈول پنڈلیوں کی بناوٹ نظر آتی تھی۔ پاؤں میں سنبھل پوری پازیبیں، گلبدن کا پائجامہ اس قدر کسا ہوا کہ لگتا تھا بدن پر پہنا نہیں مڑھا گیا ہوگا۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص ۱۰۱)

فاروقی نے مرقع کشی اور منظر نگاری میں بے مثال نثر تخلیق کی ہے، فاروقی کو بندش الفاظ اور جملوں کی تراش خراش میں ید طولی حاصل ہے، وہ خودنمائی کے لیے ایسا نہیں کرتے بلکہ دہلوی تہذیب و ثقافت کا بیانیہ اس کا متقاضی ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ادبی وتنقیدی نثر کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فاروقی اسی طرز کا تتبع کر رہے ہیں تا کہ پھر سے اس کا احیا کیا جا سکے۔ فاروقی کے یہاں نثر کی سلاست قاری کو اپنی گرفت میں لیے بغیر نہیں چھوڑتی، یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بہت گورا رنگ، دبلا ڈیل، کشیدہ قامت، سفید داڑھی، کچھ نوک دار نفاست سے ترشی ہوئی، لبیں کتری ہوئی، لیکن بہت ہلکی نہیں، بہت لطیف سبز ڈھاکے کی ململ کے انگرکھے کے نیچے سفید براق شبنم کا کرتا، اتنا سفید کہ ململ کی سبزی معلوم ہی نہ ہوتی تھی، انگرکھے پر کوئی عبا یا چغہ نہ تھا لیکن پاس ہی نہایت سلیقے سے تہہ کی ہوئی کاغذی جامہ وار کی عبا، خفیف سبز و زرد دھاریوں والا مشروع کا ڈھیلا پاجامہ۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں جن میں شب بیداری کی کچھ کچھ سرخی۔ سر پر چوگوشیہ کڑھی ہوئی ٹوپی جس کے نیچے سے سفید بالوں کی ایک لٹ کان کے پاس کاکل کی صورت ایک منظّم انداز بے پروائی سے جھانک رہی تھی۔ میں نے اس قدر خوب صورت اور اس قدر پر رعب شخص کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور میں کیا، شاید اس ساری محفل نے کبھی نہ دیکھا ہو، سب اس طرح مؤدّب تھے گویا کوئی دربار ہو۔ اگر شخصیت کے داب و دبدبہ کے لحاظ سے وہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالم گیر برد اللہ مضجعہ لگتے تھے تو دل نوازی کے لحاظ سے قطبِ دَوراں حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس سرہ ونور اللہ مرقدہ کی یاد دلاتے تھے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص ۸۸)

جزئیات نگاری:

جزئیات نگاری، منظر نگاری اور محاوراتی زبان کی پیش کش زبان کے ہی مختلف زاویے ہیں، یہی زبان کا افتخار ہے، اسی کے سبب داغ نے سارے جہاں میں دھوم ہونے کی بات کہی تھی۔ فاروقی نے اپنے فکشن میں زبان کے اس افتخار کو قائم رکھنے کی بھرپور سعی کی ہے، فاروقی کے یہاں جزئیات نگاری اپنے شباب پر نظر آتی ہے، یہ اقتباس دیکھیں، اس میں دلی کی اعلیٰ زبان اور اہلِ دہلی کی نزاکت، حُسن پرستی ،عیش کوشی، خوش سلیقگی اور بلند معیار زندگی کا پتہ چلتا ہے:

''بالکل سیاہ رنگ کا مرکب، نہایت بلند وبالا، عراقی مرکبوں سے بھی زیادہ تنومند ایک نظر تو لگا ہی نہیں کہ فرس ہے، مرصع ساز و یراق سے آراستہ، رکاب میں شہسوار کی جوتی ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی، سنہری روپہلی کسی ہوئی لجام۔ فرس کی ہال میں موتی پروئے ہوئے، اس کے سر پر سفید سرخ نیلگوں پروں کی کلغی۔ سیاہ عمامہ بر سر اور چارقب جیسا مخملی لباس در بر، لیکن زیور شاید کچھ نہیں، ایک لمحے کے لیے آنکھ اس کی رکاب پر دوبارہ پڑی تو پتا لگا کہ سوار کی جوتی ہی نہیں اس کی رکاب بھی الماس نگار ہے۔ گردن اونچی اُٹھی ہوئی، ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا، نگاہ بالکل روبرو، گویا بھرے پڑے شہر سے نہیں کسی لق و دق صحرا سے گذر رہا ہو، چہرے پر شادابی لیکن احساس برتری اور جذبۂ نخوّت کی وجہ سے ایک طرح کی ہلکی سی رونق اور چمک، جسے دیکھ کر آنکھیں روشن بھی ہوں اور خوف بھی آئے، اس قدر پر رعب کہ نگاہ ٹھہرتی نہ تھی، ایک ہاتھ میں قد آدم سے طویل نیزہ بجلی کی طرح روشن۔ بدن قطعی ساکت، لیکن تحرک اور شور کے تاثر سے لبالب، جیسے استاد منصور یا منوہر کے مرقعے کی کوئی تصویر ہو، یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ سوار کا چہرہ مہرہ قد و قامت، یہ سب کیسا

ہے، چاروں طرف، ہر طرف ایک روشنی کا احساس ہوتا تھا۔''
(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص۷٦)

شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں میں سب سے دل چسپ زبان ہے، وہ زبان جو کلاسیکی دَور کی ادبی وتہذیبی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے، دلی کی زبان کوئی فاروقی سے سنے، ایسا لگتا ہے جیسے عہد مغلیہ کی بامحاورہ اور شستہ زبان سن رہا ہو، فارسی آمیز تراکیب، شگفتہ تلمیحات اور شاہی جاہ وجلال اس کے لہجے میں سرایت کیے ہوئے ہے، اس قدر لطف آمیز کہ بس کیا کہنے، جب فاروقی اشراف کے مکالمے رقم کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دربار اردوے معلّٰی سجا ہو۔ جب ٹھیٹھ عورتوں کی محاوراتی زبان لکھتے ہیں تو دہلی اور پیرامنش کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، مرزا مظہر جان جاناں کی بیوی جب بدزبانی پر اُترتی ہے تو اس وقت کی زبان ملاحظہ کریں:

''ارے کہاں ہے وہ بھڑوا مرزا، کہیں مر گیا کیا۔ بڑا پیر اولیا بنا پھرتا ہے، تانبے کے پیسے پر رکھ کر اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلاؤں، اس سے کہو کسی اور کو اپنے ناز دکھلائے، یہاں تیسرا پہر ہونے کو آیا، میں دروازے پر کھڑی سوکھتی ہوں، اب تک میرے محافے کے ساتھ چلنے والے نفر نہیں آئے۔ اے لوگو بتاؤ میں اکیلی کس طرح ہرے بھرے صاحب کی درگاہ پر جاؤں۔ میں نہ جاؤں گی تو کیا وہ اپنی ماں بہنو کو بھیجے گا؟ کون اس کی صحت اور سلامتی کی دعا کرے گا، کون اس کے نخرے اُٹھانے والے مریدوں کو جمع کرنے کا انتظام کرے گا؟'
(شمس الرحمٰن فاروقی: سوار اور دوسرے افسانے، ص۸۹)

اختتام:

خیرالدین اور عصمت جہاں کی ملاقات کہانی کا نقطۂ عروج ہے اور خیرالدین کا عصمت سے کنارہ کشی کر لینا کہانی کا اختتام ہے، کہانی کے اختتام پر خیرالدین کی 'انا'

جیت جاتی ہے اوراس کی مولویانہ غیرت بھی جاگ جاتی ہے،سوار دولت جاوید سے خیرالدین کی منت تو پوری ہو جاتی ہے لیکن ستی کی مراد نامکمل رہتی ہے اور خیرالدین کا یہ شک کہانی کے اختتام کی پیشین گوئی ثابت ہوتا ہے کہ انوکھی صورتوں میں مانگی جانے والی مرادتو پوری ہو جاتی ہے لیکن اس کے بدلے میں کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ خیرالدین اپنی والدہ کے انتقال کے بعد سوداوی مزاج ہو جاتا ہے اور مدرسہ رحیمیہ بھی چھوڑ جاتا ہے،عصمت جہاں کے آنے سے خیرالدین کی زندگی میں نیا رنگ آتا ہے،لذت عشق نے خیرالدین میں چھپے عام انسان کو بے پردہ کردیااور عشق نے لذت زیست کا مزہ چکھایا۔خیرالدین کی تنہا زندگی کی کڑیاں فاروقی کی اس نظم میں مل گئیں جوانھوں نے کہانی کے آغاز میں نقل کی تھی۔طاہرہ نورانی کی رائے یہ ہے کہ:

> ’’حرفِ آخر یہ ہے کہ فاروقی کی تمام عمر کی عرق ریزی کا نتیجہ ’سوار‘ ہے۔لگ بھگ ان کی تمام تصانیف کا نچوڑ ’سوار‘ میں ملتا ہے۔اس میں لفظ ومعنی کی بحث بھی ہے،اور اردو کے ابتدائی زمانے کا ذکر بھی،ساحری شاہی،صاحب قرانی بھی ہے اور انداز گفتگو بھی۔اردو غزل کے اہم موڑ بھی ہیں اور تحقیق وتنقیدی شعور بھی،بیان کی دل آویزی بھی ہے اور اردو زبان کا جادو بھی،انھیں تمام خصوصیات کی بنا پر سوار کا شمار اردو کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے اور فاروقی کو اردو افسانہ نگاری کا شہسوار تسلیم کیا گیا،لہٰذا فاروقی کے لیے یہ اعزاز اور افسانے کی شہرت بےسبب نہیں۔‘‘
>
> (شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری کا جائزہ،ص ۳۹)

’غالب افسانہ‘ پڑھنے کے بعد ’سوار‘ کا مطالعہ کیا۔غالب افسانہ میں کرداروں کی کثرت ہے لیکن سوار میں نہ میؔر ہے نہ سوؔدا،نہ دردؔ نہ غالبؔ،بس دلی ہی دلی ہے۔فاروقی نے تاریخ سے زیادہ ’روحِ تاریخ‘ کو پیش کرنے پر زور صرف کیا ہے کیوں کہ روحِ تاریخ کو جانے بغیر تاریخ کو نہیں جانا سکتا،تاریخ اور روحِ

تاریخ کا حسین امتزاج ٹالسٹائی کے ناول 'وار اینڈ پیس' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ٹالسٹائی نے تاریخ کو اس طرح تشکیل دیا کہ کئی نسلوں پر محیط حقیقت کے پہلو کو ہشت پہلو بنا دیا ہے، اس کے پیچھے تاریخ کی چھان پھٹک اور تاریخ سے پہلے کے عناصر پر تحقیق کا راز پوشیدہ ہے، اس نوعیت کی تحریریں بہت جدو جہد کے بعد وجود میں آتی ہیں، لکھنے والا ہی بہتر جانتا ہے، البتہ اس طرح کی تخلیقی نثر جس عالمِ جذب کا تقاضا کرتی ہے وہ اس عالم میں تو میسر نہیں ہے، اب سے دو صدی قبل یہ عام گفتگو کا لہجہ تھی۔ مبین صدیقی لکھتے ہیں:

''عمر شیخ مرزا خاص مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زبان کی ایسی تہذیب و تزئین کی ہے کہ جس میں پرانی دہلی کی چہیتی اردو کے ہمراہ کیف و سرود، منطق و فلسفہ و تصوف تک ہزار رنگینیاں کہ درجہ مثال کو جا پہنچتی ہیں، ایسی تحریروں سے نئی نسل جس قدر مستفید ہو سکے بڑی بات ہوگی۔''

(شب خون، شمارہ ۲۲۵ بابت ماہ اپریل ۱۹۹۹، ص ۷۶)

دہلی سے انوار رضوی لکھتے ہیں:

''سوار ایک پیریڈ اسٹوری ہے، اس کہانی کے پسِ پشت کس درجہ تحقیق ہے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اس میں اٹھارہویں صدی کی دہلی کو اپنے کرداروں، کلچر اور زبان کے ساتھ زندہ کر دیا گیا ہے۔ دہلی کی گلی کوچے تک اس کہانی میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ بیشتر تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہ میں اٹھارہویں صدی کی دہلی پس ماندہ اور طنز و مزاح کا موضوع ہے لیکن سوار کی دہلی بھری پری اور اپنے غیر معمولی کرداروں کے باعث لائق محبت و توقیر ہے۔'' (شب خون، شمارہ ۲۲۵ بابت ماہ اپریل ۱۹۹۹، ص ۷۶)

شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں میں کچھ مناسبات یا مماثلت دیکھنے

کوملتی ہے چوں کہ افسانے یکے بعد دیگرے خلق کیے گئے لہٰذا کرداروں کے مکالمات،نفسیات،لفظیات اور منظر نگاری میں کئی جگہ مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً 'غالب افسانہ' کا بنی مادھورسوا اور 'سوار' کا بدھ سنگھ قلندر دونوں کی وضع قطع،فلسفہ طرازی،تصوّف، جمالیات اور ادب سے روشناسی ملتی جلتی ہے، غالب اور مرزا مظہر سے ملاقات کے آداب میں مناسبات کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے،اس سے یہ اندازہ لگانا مزید آسان ہوجاتا ہے کہ بنی مادھورسوا ہی عمر شیخ مرزا ہے۔الحاصل شمس الرحمٰن فاروقی نے دہلی کی گمشدہ تہذیب اور فراموش کردہ عظمت کی بازیافت کے لیے متعدد کتب سے اس کے نمونے اخذ کر کے صحت مند بیانیے میں مکمل فنکاری سے پرویا ہے۔دلی کی تہذیب زبان، ثقافت، سیاسیت، اخلاق،تصوّف،معیشت، مذہب، بودوباش غرض کہ ہر زاویے سے رنگارنگی سے عبارت ہے،اس تہذیب کو کسی ایک کتاب یا ایک حوالے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ شمس الرحمٰن فاروقی کے فکشن میں وہ تمام زاویے جو دلی کی اعلیٰ تہذیب کو پیش کرتے ہیں دیکھے جاسکتے ہیں۔یہی فاروقی کا کمال ہے کہ انھوں نے ایسی متنوّع چیز کو فکشن کے چند صفحات میں سمیٹ دیا جو تاریخ،فلسفہ، ادب اور سیاست کی طویل داستان پر مشتمل تھی۔دہلوی تہذیب کی اہمیت پر یہ اقتباس بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔

> ''دلی ایک شہر نہیں،ایک تہذیبی روایت ہے ۔روم اصفہان ، غرناطہ،سمرقند،استنبول،بغداداور کابل کی طرح دلی کی عظمتِ پارینہ سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں،ترکوں کے زمانۂ حکومت میں علما،فقہا،صناع اور صاحب کمالوں نے چاردانگ عالَم سے آکر یہاں سکونت اختیار کی تو ایشیا میں کوئی شہر اس کی ٹکر کا نہ رہا۔مغلوں کے وقت میں بابر نے اسے دوبارہ بسایا تو ہندوستان کی قدیم تمدنی روایات کو ملک کے کونے کونے سے سمیٹ کر یہاں لایا

گیااور انھیں خاطر خواہ فروغ دینے کی سعیِ مشکور ہوئی ۔اس کے بعد جب شاہجہاں نے بڑے چاؤ چونچلے سے فصیل دہلی یا جہاں آباد کی بنیاد رکھی تو یہ شہر جو اب اُجڑا دیار کہلاتا ہے اپنے حُسنِ انتظام،سجاوٹ،خوب صورتی،فن اور صناعی کے اعتبار سے یکتائے روزگار ٹھہرا۔‘‘

(سید ضمیر حسن دہلوی: غالب کی دلی،ص۹)

☆☆☆